© rasailojaraid.com

شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن

از

(سعید احمد)

ابتدائی حالات | شمس العلماء مولوی عبدالرحمٰن صاحب سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی دہلی یونیورسٹی نسلاً مسلمان راجپوت تھے۔ آپ کے اسلاف جھیڑا ضلع میرٹھ کے قدیم باشندے تھے۔ یہ لوگ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں دکن کی کسی مہم پر گئے ہوئے تھے کہ وہاں کسی بزرگ کے مزار پر کچھ کرامتیں دیکھیں اور مسلمان ہو گئے۔ مرہٹوں کا جب عہد آیا تو انھوں نے ان نومسلم راجپوتوں کو جھیڑے سے نکال دیا یہ لوگ تتر بتر ہو گئے اور مختلف علاقوں میں جا بسے۔ مولوی صاحب کا تعلق راجپوتوں کے خاندان تنور یا تنوار سے تھا۔ جھیڑے سے اُجڑنے کے بعد مولوی صاحب کے پردادا اپنے پانچ بیٹوں کو ساتھ لے بلند شہر میں آکر آباد ہو گئے تھے۔ اس لئے آپ کا آبائی وطن بلند شہر ہی ہوا۔

ولادت اور تعلیم | مولوی صاحب کے والد ماجد صاحب جے پور جا کر فوج میں ملازم ہو گئے تھے اور ترقی کرتے کرتے نائب میجر کے عہدہ تک پہنچ گئے تھے۔ شمس العلماء کی پیدائش وہیں جے پور میں ۱۰ر فروری ۱۸۷۳ء کو ہوئی اور اپنی عمر کے تیس برس آپ نے وہیں گذارے۔ ابتدائی تعلیم مکتب کے طریقہ پر ہوئی اور بعد میں مہاراجہ کالج جے پور میں داخل ہو کر عربی فارسی اور اس زمانہ کے علومِ متداولہ کی تکمیل کی۔ فراغت کے بعد اسی کالج میں پروفیسر مقرر ہو گئے۔

ملازمت | کچھ دنوں کے بعد یہاں سے جی اُچاٹ ہو گیا تو ۱۹۰۳ء میں لاہور کے رنگ محل ہائی سکول میں عربی اور فارسی کے استاذ یعنی ہیڈ مولوی مقرر ہو گئے لاہور کے قیام میں اسکول میں ٹیچری کرنے کے ساتھ ساتھ پیسہ اخبار میں بھی کام کرتے تھے۔ لکھنے اور مضمون نگاری کی مشق انھیں ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئی۔ اسی سلسلہ میں مقدمہ ابن خلدون کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو غالباً پیسہ اخبار کی طرف سے ہی شائع ہوا تھا۔

سینٹ اسٹیفنس کالج دہلی سے تعلق

سنہ ۱۹۰۶ء میں نہ صرف دہلی بلکہ شمالی ہند کے مشہور کالج "سینٹ اسٹیفنس کالج"[1] میں عربی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی اور اس کا اشتہار اخبارات میں شائع ہوا۔ تو لاہور میں شمس العلماء کا ایک بے تکلف دوست تھا۔ یہ شخص شاید (اب ٹھیک یاد نہیں رہا) پان، سگرٹ کی دکان کرتا تھا اور مولوی صاحب روزانہ اس کی دکان پر شام کے وقت ایک آدھ گھنٹہ کے لئے جاکر بیٹھا کرتے تھے۔ اس شخص کو سینٹ اسٹیفنس کالج کی جگہ کا علم اخبارات کے ذریعہ ہوا تو اس نے مولوی صاحب سے کہا کہ درخواست بھیج دیجئے۔ اچھا موقع ہے۔ لیکن مولوی صاحب ٹھہرے اول تو فطری طور پر قناعت پسند۔ گوشہ گیر اور پھر یہ خیال کہ کالج بڑا نامی گرامی ہے اور میں ایک ہائی اسکول کا ہیڈ مولوی۔ بھلا وہاں میری کیا دال گلے گی۔ چپ ہو کر بیٹھ رہے اور درخواست نہیں بھیجی۔ مولوی صاحب کے پنواڑی دوست نے کیا کام کیا؟ خود مولوی صاحب کی طرف سے درخواست لکھی اور اللہ کا نام لے کالج کے پرنسپل کے نام روانہ کر دی۔ درخواست کے ساتھ ایک عقل مندی یہ بھی کی مولوی صاحب نے مقدمہ ابن خلدون کا جو اُردو ترجمہ کیا تھا اس کی ایک جلد بھی نتھی کر دی تھی۔

یہاں خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ اس پوسٹ کے لئے جو درخواستیں آئی تھیں اُن میں عربی کے ایم۔ اے بلکہ پی۔ ایچ ڈی تک کی درخواست تھی۔ آخر انتخابی بورڈ کا جلسہ ہوا۔ مولوی نذیر احمد صاحب دہلوی مرحوم جو اُردو کے عناصرِ خمسہ میں سے ہونے کے علاوہ عربی زبان کے بڑے فاضل اور ادیب تھے۔ وہ اس بورڈ کے ممبر تھے اور امیدوار کی لیاقت و قابلیت سے متعلق مولوی صاحب

---

[1] یہ دہلی کالج ہے جس میں مرزا غالب فارسی کے استاد مقرر ہوتے تھے۔ لیکن چونکہ کالج کا پرنسپل مرزا صاحب کے استقبال کے لئے اپنے دفتر سے باہر نہیں نکلا تھا اس لئے مرزا اس کو اپنی توہین سمجھ کر واپس چلے آئے تھے اور استعفا دے دیا تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی رائے ہی حرفِ آخر کا حکم رکھتی تھی۔ اُس زمانہ میں شاید امیدواروں سے انٹرویو کرنے کی رسم بھی نہیں تھی۔ سب درخواستیں مولوی نذیر احمد صاحب کے سامنے رکھ دی گئیں انھیں دیکھتے دیکھتے جونہی مولوی صاحب کی نظر مقدمہ ابن خلدون کے اردو ترجمہ پر پڑی جو شستہ و رفتہ اور سلیس و شگفتہ زبان میں کیا گیا تھا دیکھتے ہی پھڑک اٹھے اور اپنا آخری اور قطعی فیصلہ مولوی عبدالرحمن صاحب کے حق میں دے دیا۔ موصوف کو شاید وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان کا انتخاب یا آج کل کی بولی میں چناؤ ہو جائے گا۔ اب اچانک تقرر نامہ پہنچا تو حیرت میں رہ گئے اور آخر کار دہلی چلے آئے۔ اُس زمانہ میں روپیہ پورے سولہ آنہ کا ہوتا تھا۔ اور ہر چیز میں برکت تھی۔ آج کل کے سے جان لیوا خرچ اخراجات بھی پیدا نہیں ہوئے تھے اس لئے اُس زمانہ کے پچھتر روپیہ کسی طرح آج کل کے پانسو سے کم نہیں تھے اسکول کے ہڈ مولوی کے درجہ سے ترقی کر کے ایک نہایت وقیع کالج کے پروفیسر ہو گئے اور اطمینان و فارغ البالی کے ساتھ گذر بسر کرنے لگے مولوی صاحب اکثر اس واقعہ کا ذکر کر کے فرمایا کرتے تھے کہ بھئی! ہم تو یہاں خود آئے نہیں لائے گئے ہیں۔ انسان چاہے نہ چاہے جہاں کا آب و دانہ اس کی قسمت میں ہوتا ہے وہ اسے ضرور ملتا ہے، پھر اپنے پٹواری دوست کے احسان کا تذکرہ کرتے اور اپنے جذبۂ احسان شناسی کا اظہار کرتے تھے۔ اس وقت ان کی آنکھیں نم آلود ہو جاتی تھیں۔

۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک یعنی کم و بیش ۳۳ برس اسی کالج سے وابستہ رہے جب دلی یونیورسٹی قائم ہوئی تو چونکہ یونیورسٹی میں باتنخواہ پروفیسر کوئی نہیں تھا اس لئے یونیورسٹی کے آنریری صدر شعبۂ عربی و فارسی و اردو منتخب ہو گئے اور کالج سے ریٹائرڈ ہونے تک وہ برابر اس عہدے پر رہے۔

مولوی صاحب نے یہ زمانہ بڑی آن بان اور شان کے ساتھ گذارا۔ کالج میں اگرچہ تقرر بحیثیت استاذ عربی کے ہوا تھا لیکن فارسی بھی پڑھاتے تھے۔ کالج مشن کا تھا اس لئے بڑی ٹیپ ٹاپ اور قاعدہ قانون کا کالج ہے۔ اسٹاف میں متعدد یورپین اور طلبا اکثر و بیشتر اونچے گھرانوں کے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسی فضا اور ایسے ماحول میں ایک عربی کے استاد کو اپنے لئے کوئی وقیع مقام حاصل کر لینا آسان نہیں تھا۔ پرنسپل نہایت مردم شناس تھے۔ لیکن مولوی صاحب جس قابلیت و لیاقت وضع داری اور رکھ رکھاؤ کے انسان تھے اُس کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد کالج میں امتیاز پیدا کر لیا۔ عربی فارسی کے وہ استاذ اور اُس میں باکمال تو تھے ہی اُن کا عہد مغلیہ سلطنت کا مطالعہ بھی بڑا ٹھوس اور وسیع تھا۔ چنانچہ سالہا سال تک تاریخ میں ام۔ اے کے طلباء کو مغل عہد پر لکچر دیتے رہے۔ ان کے یہ لکچر اس درجہ پُر از معلومات ہوتے تھے کہ صدر شعبۂ تاریخ جو ایک یورپین تھا وہ بھی کسی کسی لکچر میں شریک ہوتا تھا اور پرنسپل صاحب جن کو تاریخ کا خاص ذوق تھا وہ بھی گاہے گاہے آتے تھے۔

مولوی صاحب اگرچہ درسِ نظامی کے باقاعدہ فارغ التحصیل تھے اور اس بنا پر اُن کو سب ہی علوم و فنونِ اسلامیہ سے دلچسپی اور مناسبت تھی لیکن عربی ادب و تاریخ اور اُس میں بھی خاص کر عہد جاہلیت اُن کا خاص موضوع تھا۔ پروفیسر مارگولیوتھ نے عہد جاہلیت کی شاعری پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ سب اختراعی اور عہد بنی عباس کی موضوعِ شاعری ہے جس کو عہدِ جاہلیت کے شعراء کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ معجم الادباء وغیرہ کے جو بیانات خلف الاحمر اور حماد الراویہ وغیرھما کے متعلق ہیں اُن سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ پروفیسر مارگولیوتھ کے اسی نظریہ کی بنیاد پر اُن کے شاگرد رشید ڈاکٹر طٰہٰ حسین مصری نے پہلے کتاب الشعر الجاہلی اور پھر الادب العربی لکھی۔ شمس العلماء اس نظریہ کے زبردست نقاد تھے اور وہ اگرچہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ خلط ملط ضرور ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی عہدِ جاہلیت کی شاعری اور عہدِ اسلام کی شاعری دونوں کی زبان اور طرزِ بیان میں وہی فرق ہے جو کسی زبان کے ابتدائی عہد اور عہد ارتقا میں ہوتا ہے اور اُسی کی وجہ سے زبان کا ایک نکتہ داں کسی ایک شعر کو سن کر فوراً معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کس زمانہ کا شعر ہے۔ راقم الحروف نے موصوف سے تلمذ کے زمانہ میں دیوان عبید بن الابرص جو ایم۔ اے عربی کے نصاب میں شامل تھا پڑھا ہے۔ اس کو پڑھاتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقت وہ اکثر یہی بحث اُٹھاتے تھے اور اُس پر مدلل کلام کرتے تھے۔

سفر یورپ و حج ۱۹۲۸ء میں آکسفورڈ میں جو بین الاقوامی اورینٹیل کانفرنس ہوئی تھی۔ شمس العلماء نے اُس میں دہلی یونیورسٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی تو اس کانفرنس میں بھی عربی زبان میں اسی موضوع پر مقالہ پڑھا جس میں پروفیسر مارگولیوتھ کے نظریہ پر سخت لیکن نہایت مدلل اور معقول بحث کی تھی۔ کانفرنس میں اس مقالہ کا بڑا چرچا ہوا اور مصر کے اخبارات نے اس کے مختلف اجزا الگ الگ چھاپے اور ان پر نوٹ لکھے۔ کانفرنس سے فارغ ہو کر اور انگلینڈ کی سیر و سیاحت کر کے جب مولوی صاحب مصر پہنچے تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اُن کی آمد سے پہلے اُن کی شہرت مصر پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اب مصری اخبارات نے آپ کے فوٹو شایع کئے اور مصر کے بڑے بڑے اربابِ قلم ادبا، اور اخبار نویس یہاں تک کہ خود ڈاکٹر طٰہٰ حسین ملاقات کے لئے آپ کے ہوٹل میں آئے۔ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ گورنمنٹ کالج لاہور نے جو اُس زمانہ میں لندن میں مقیم تھے اس اورینٹیل کانفرنس کا آنکھوں دیکھا حال معارف اعظم گڈھ میں لکھا تھا اور اُس میں مولوی صاحب کی عربی سج دھج۔ اور مقالہ کا خاص طور پر تذکرہ کیا تھا۔ مولوی صاحب نے واپسی میں ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی اور سب سے آخر میں حج و زیارتِ حرمین شریفین سے سرفراز ہو کر دلی واپس ہوئے۔ اکبر الہ آبادی نے کہا تھا۔

چلے ہیں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

لیکن شمس العلماء نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا کہ دنیا میں جو صاحبِ نظر بھی ہوتے ہیں اور صاحبِ ذوق بھی وہ خدا کی شان کو مبتدا بنا کر خدا کے گھر کی زیارت کو اُس کی خبر بناتے ہیں اور اس طرح زندگی کے جملہ کو جملۂ تام کرتے ہیں "ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن"

اس پورے سفر میں نو ہزار روپے خرچ ہوئے تھے۔ تین ہزار یونیورسٹی نے دئے تھے باقی چھ ہزار شمس العلماء نے اپنے پاس سے خرچ کئے۔ پورا سفر غالباً تین ماہ میں طے ہوا تھا۔

اندازِ تحریر اُردو کے عناصرِ خمسہ میں سے مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد دہلوی سے غیر معمولی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طور پر متاثر تھے اور ان کے اندازِ نگارش اور انشاء پردازی کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اسی کا غالباً یہ اثر تھا کہ خود شمس العلماء کی تحریر ان دونوں بزرگوں کے اندازِ تحریر کا سنگم ہوتی تھی اور اس وجہ سے اُس میں زندہ رہنے کی صلاحیت نسبتہً زیادہ ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کو یہ فقرہ کچھ انوکھا معلوم ہو اس لئے اس کی کسی قدر تشریح ضروری ہے۔

اصل یہ ہے کہ مولوی محمد حسین آزاد کے طرزِ نگارش کی خصوصیت ان کی استعارہ پیمائی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی بات بھی کہتے ہیں تو تشبیہ و استعارہ کے پیرایہ میں کہتے ہیں۔ اس سے بلاشبہ معقولات محسوسات کے پیکر میں جلوہ نما ہو کر نظر کے سامنے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ عبارت میں حسن اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے اور کلام کی قوتِ تاثیر میں اضافہ ہو جاتا ہے لیکن ہر چیز کا ایک محل موقع ہوتا ہے۔ آزاد کی بڑی خامی یہ ہے کہ وہ اس کا بالکل لحاظ نہیں رکھتے جو مطلب دو سادہ لفظوں میں بڑی بلاغت کے ساتھ ادا ہو سکتا ہے اسے بھی ایک داستان بنا دیتے ہیں۔

مولوی نذیر احمد دہلوی کی خصوصیت محاورات بندی ہے۔ لیکن اول تو یہ دلی کے ٹکسالی محاوروں کے ساتھ عربی کے موٹے موٹے اور بھاری بھرکم الفاظ اور بندشوں کا پیوند لگاتے چلے جاتے ہیں جس سے ان کی عبارت گنگا جمنی ہو جاتی ہے اور پھر محاوروں کی بھرمار بھی اس غضب کی ہے کہ اُس میں نہ اعتدال و توازن ہے اور نہ موقع محل کی رعایت ہے۔ سنجیدہ علمی مباحث پر بھی گفتگو کریں گے تو اسی انداز میں اور مذہبی احکام و مسائل سنائیں گے تو وہ بھی دلی کی اسی گھریلو بولی میں۔ اس طرز کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد دونوں اپنے اپنے طرز کے موجد بھی تھے۔ اور خاتم بھی۔ ان کے بعد نہ کوئی شخص ان کی پیروی کر سکا اور نہ مقبولیت عام کے دربار میں ان کو بقائے دوام کا خلعت مل سکا۔ یہ دونوں طرز ایک خاص عہد کی پیداوار تھے اور اس عہد کے ساتھ وہ بھی ختم ہو گئے! گویا اُس ایک پھل کی مانند تھے جو اپنے موسم میں ہی اچھا اور لذیذ لگتا ہے۔ بے موسم اسے کوئی نہیں پوچھتا۔ آج لوگ ان کی کتابیں پڑھتے ہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تو اُن کو کلاسکل لٹریچر سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ اس کے برخلاف شبلی اور حالی کی کتابوں پر ابھی قدامت کی ٹوپی لگنی شروع نہیں ہوئی۔ وہ آج بھی ایسی ہی تازہ ہیں جیسی کہ کل تھیں۔

مولوی عبدالرحمٰن صاحب نے آزاد اور نذیر احمد دونوں کی پیروی کی۔ لیکن اس طرح کہ استعارہ کی زبان ایک سے لی اور محاورہ بندی دوسرے سے اور پھر دونوں کو مناسب مقدار میں لے کر ان کے امتزاج سے اپنا ایک ایسا طرز ایجاد کیا جس میں توازن بھی تھا اور اعتدال بھی حسن بھی تھا اور نغمگی بھی۔ خوش آہنگی بھی تھی اور صوتی جمال بھی۔ چھوٹے چھوٹے فقرے ترشے ترشائے۔ ہلکے پھلکے الفاظ سہل و سلیس اور نرم و رواں لیکن باوقار و تمکنت افسوس ہے کہ موصوف نے ادبی کاوشوں کا کوئی بڑا ذخیرہ اپنی یادگار نہیں چھوڑا۔ البتہ ۱۹۲۲ء میں اردو شعر و شاعری پر دلی یونیورسٹی میں کچھ توسیعی لکچر دیئے تھے انھیں کو بعد میں دوستوں اور شاگردوں کے اصرار، "مرآۃ الشعر" کے نام سے ایک ضخیم کتاب کی شکل میں چھپوادیا تھا جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے انھیں یاد ہوگا کہ جب یہ کتاب چھپ چھپا کر منظر عام پر آئی ہے تو ایسا معلوم ہوا کہ ادبی دنیا میں ایک بھونچال سا آگیا ہے۔ فنِ شعر۔ اس کے اصولِ بلاغت اور اردو شاعری کے مزاج اور خصوصیات پر جس دقتِ نگاہ اور تحقیق کے ساتھ اس کتاب میں مبسوط مفصل اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے اُس کے پیشِ نظر یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ الطاف حسین حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری کے بعد اردو فنِ شعر و شاعری پر اگر کوئی عہد آفریں کتاب لکھی گئی ہے تو وہ یہی تھی۔ اخبارات میں بڑے شاندار تبصرے ہوئے۔ اس کتاب کے مختلف ابواب بہت سوں نے اپنے ہاں نقل کئے۔ لاہور کا اخبار انقلاب جو غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کی ادارت میں بڑے طمطراق سے نکلتا تھا اور جس کی اخباری حیثیت کے علاوہ ادبی اہمیت اور حیثیت بھی مسلم تھی اُس نے مرآۃ الشعر کو ادب و زبان کا ایک بلند پایہ ادبی شاہکار لکھا اور اس کا ایک باب "مصور اور شاعر" بہت نمایاں طریقہ پر شائع کیا اس خاکسار کو مولوی صاحب سے پہلا غائبانہ تعارف انقلاب کے اسی مضمون سے ہوا تھا جب کہ میں دارالعلوم دیوبند

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں طالب علم تھا۔ علی گڈھ کے سہ ماہی ادبی رسالہ مستقبل اور معارف اعظم گڈھ ایسے بلند پایہ رسالوں نے بھی بڑی کشادہ دلی کے ساتھ اس کتاب کے مصنف کو خراجِ تحسین و آفریں پیش کیا۔ پنجاب یونیورسٹی نے آنرزان اردو و ادیب فاضل کے نصاب میں شامل کیا۔ معلومات تحقیق اور وسعتِ بحث کے علاوہ جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس کتاب کا اسلوبِ نگارش۔ طرفگیِ بیان۔ اور حسنِ زبان تھا۔ لیکن مصنف چونکہ ایک کالج کا پروفیسر تھا اور صحافت یا ادب کی اخباری دنیا کا انسان نہیں تھا اور پھر اس کے بعد اس کا کوئی اور ادبی کارنامہ سامنے بھی نہیں آیا اس بنا پر اس کتاب کا اور اُس کے مصنف کا کچھ دنوں تو چرچا رہا پھر لوگ اس حیثیت سے جلد ہی بھول گئے۔ گویا

"خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود"

جہاں تک تصنیفی یادگار کا تعلق ہے اس کے سوا کوئی اور لائق ذکر کتاب نہیں ہے البتہ مغلیہ سلطنت کے نظام منصب داری" پر اُن کا ایک بڑا قابل قدر مقالہ اورینٹل کالج میگزین میں بہت دنوں تک نکلتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور۔ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن اور اورینٹل کانفرنس کے جلسوں میں برابر شریک ہوتے تھے اور کوئی نہ کوئی مقالہ کبھی عربی میں اور اکثر و بیشتر اُردو میں پڑھتے تھے۔ اس سلسلہ میں اُن کا مشہور مقالہ وہ ہے جو ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کے جلسہ میں جزیہ پر پڑھا تھا اور جو بعد میں ادارہ کی روداد میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ برہان میں بھی ایک مضمون "متحدہ قومیت اور اسلام" کے عنوان سے نکلا تھا اور کئی قسطوں میں تمام ہوا تھا۔ مولوی صاحب کے صاحبزادہ رشید صاحب کا بیان ہے کہ حضرت مرحوم نے اپنے ابتدائی زمانہ میں مقدمہ ابن خلدون کے علاوہ "الحصون الحمیدیہ" کا بھی ترجمہ کیا تھا اور ان کے نام سے چھپ بھی گیا تھا۔ لیکن خاکسار کی نظر سے نہیں گذرا۔ اس کے علاوہ جے پور میں "العروس البدیعہ فی علم الطبیعہ" نامی کتاب کا بھی ترجمہ کیا تھا لیکن دہلی پہنچنے کے بعد کوئی "تلمیذ رشید" اسے لے اُڑا اور پھر وہ کتاب واپس نہیں ملی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگریزی کی قابلیت دہلی آنے تک انگریزی سے بالکل نا آشنا تھے۔ لیکن یہاں کی سوسائٹی اور ماحول میں رہ کر انگریزی سیکھنے کا ارادہ کیا تو ایک صاحب سے باقاعدہ پڑھنی شروع کی۔ تین چار کتابیں ہی پڑھی تھیں کہ وہ سلسلہ منقطع ہو گیا اور اب خود انگریزی لغت اور قرآن مجید کے انگریزی تراجم کے ذریعہ انگریزی کا مطالعہ کرتے رہے آخر اس زبان میں اتنی استعداد بہم پہنچ گئی تھی کہ انگریزی تقریر سمجھ لیتے تھے کتاب پڑھ کر اس سے مطلب نکال لیتے تھے البتہ خود انھیں انگریزی لکھنے اور بولنے میں تکلف ہوتا تھا۔ جس زمانہ میں میں ام۔اے کا طالب علم تھا بعض اوقات عجب لطف آتا تھا۔ میں انگریزی میں کوئی مقالہ لکھ کر لے جاتا تھا اور انھیں سناتا تھا تو کبھی وہ کسی لفظ یا کسی جملہ کو ناموزوں اور نامناسب بتاتے اور خود مجھ سے پوچھتے کہ اچھا بتاؤ اس کے علاوہ اور کون سے الفاظ ہو سکتے ہیں۔ میں بتاتا اور وہ ان میں سے کسی ایک کو پسند کر لیتے اور پہلے لفظ کو کاٹ کر یہ دوسرا لفظ لکھوا دیتے اور کبھی یہ فرماتے کہ یہ جملہ جو تم نے لکھا ہے یہ تو یقیناً غلط ہے۔ لیکن اب اس کے بجائے ہونا کیا چاہیے میں یہ بھی نہیں بتا سکتا ہوں۔ کل کالج میں انگریزی کے پروفیسر سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ اور کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ خود فی البدیہہ اصلاح دے دیا کرتے تھے میں نے تو وہ زمانہ دیکھا نہیں ہے لیکن لوگوں سے سنا ہے کہ جب ولایت سے واپس آئے تھے تو انگریزی بولنے کی خاصی مشق ہو گئی تھی اور روانی کے ساتھ گفتگو کر لیتے تھے۔

شمس العلماء کا خطاب مولوی صاحب طبعاً گوشہ نشین اور کم آمیز تھے اور حکام بالا دست کی خوشامد درآمد اور اُن کی دربار داری سے تو اُن کو کوئی واسطہ ہی نہیں تھا لیکن ان کے علم و فضل کی شہرت جو حکومت تک بھی پہنچی تو انھیں "شمس العلماء" کے خطاب سے نوازا گیا۔ جس ملک میں پڑھے نہ لکھے نام محمد فاضل جیسے لوگوں کو بھی شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز کیا جاتا ہو بھلا وہاں مولوی صاحب کو اس اعزاز کی کیا خوشی ہو سکتی تھی۔ لیکن انھوں نے یہ سمجھ کر کہ اس کے واپس کرنے میں بھی ایک طرح کا دکھاوا اور نمائش ہے۔ اس کو قبول کر لیا۔ لیکن وہ نہ کبھی اس کا تذکرہ کرتے تھے اور نہ اس پر فخر کرتے تھے البتہ کالج کی خاص خاص تقریبات کے موقع پر اور اساتذہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی اپنی یونیورسٹیوں کے گاؤن اور ہڈ پہن آتے تھے اور مولوی صاحب اپنے عمامہ اور چوغہ میں جو شمس العلماء کے خطاب کے ساتھ بہ طور خلعت دیا جاتا ہے۔ آتے تھے اور اس میں بڑے کھلنے لگتے تھے۔

۱۹۳۹ء میں کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو دہلی یونیورسٹی کے طلبائے قدیم کی طرف سے مولوی صاحب کو ایک بڑی شاندار الوداعی پارٹی دی گئی جو یونیورسٹی کے لان پر ہی منعقد ہوئی تھی اس پارٹی میں وائس چانسلر کالج کے پرنسپل۔ ان کا یورپین اور ہندوستانی اسٹاف۔ شہر کے بڑے بڑے لوگ شریک تھے۔ وائس چانسلر نے اپنی تقریر میں مولوی صاحب کی خدمات کا اعتراف کیا اور پھر ان کو اڈریس پیش کیا گیا۔ پرانے پرانے لوگوں کا بیان تھا کہ اس طرح کی پارٹی کبھی کسی پروفیسر کو اس کے اپنے عہدہ سے سبکدوش ہونے کے موقع پر اس سے قبل نہیں دی گئی تھی۔

مدرسہ عالیہ رام پور کی پرنسپلی

اب مولوی صاحب کا پکا ارادہ تھا کہ نوکری کہیں اور نہیں کریں گے لیکن نواب صاحب رام پور اور ریاست کے وزیر اعظم کرنل بشیر حسین صاحب زیدی جو مولوی صاحب کے شاگرد بھی تھے۔ ان کو مدرسہ عالیہ رام پور کے لئے ایک ایسے پرنسپل کی ضرورت تھی جو تعلیمی اور انتظامی اعتبار سے مدرسہ میں نئی اصلاحات جاری کر کے اس کو ترقی دے سکے۔ اب اس کام کے لئے ان کو مولوی صاحب سے اچھی اور کون شخصیت مل سکتی تھی۔ آخر نواب صاحب اور ان کے وزیر اعظم دونوں سر ہو گئے۔ مولوی صاحب نے ہر چند عذر و معذرت کی اپنے بڑھاپے کا بہانہ کیا لیکن راج ہٹ کے سامنے ذرا پیش نہ چلی۔ مولوی صاحب نے اس سلسلہ میں اپنی تنخواہ اور اختیارات کے بارہ میں جو شرائط پیش کی تھیں وہ سب مان لی گئیں۔ اور آپ ۱۹۴۰ء میں رام پور چلے گئے۔

مدرسہ عالیہ رام پور صوبہ اتر پردیش کی دیرینہ درسگاہ ہے۔ منطق اور فلسفہ میں اس کی بڑی شہرت رہی ہے اور یوں بھی لائق و قابل اور اچھے اساتذہ سے وہ کبھی خالی نہیں رہی۔ مولوی صاحب کا کام اگرچہ بحیثیت پرنسپل کے صرف انتظام تھا۔ لیکن مدارس عربیہ کے لوگ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پروفیسروں کے متعلق یہ خیال عام طور پر رکھتے ہیں کہ یہ لوگ تھوڑے بہت عربی زبان کے ادب اور تاریخ سے ضرور واقف ہوتے ہیں۔ لیکن فنون میں کورے ہوتے ہیں اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

درسِ نظامی کی فنی کتابیں نہیں پڑھا سکتے۔ اس بنار پر مدرسہ میں اپنی ساکھ قایم کرنے کے لئے مولوی صاحب نے ضروری سمجھا کہ ضعف و پیری علالت اور انتظامی مصروفیتوں کے باوجود درس وتدریس میں بھی کچھ حصہ لیں چنانچہ انھوں نے شرح مواقف اپنے نام لکھ لی اور اسے پڑھانا شروع کردیا یہ کتاب مولوی صاحب نے کیسی پڑھائی؟ اس کا حال تو مدرسہ کے اساتذہ اور طلبا سے ہی معلوم ہوسکتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی بزم میں یہ کتاب لے لی تھی مگراُن کو اس میں زحمت کافی ہوئی۔ مجھ سے فرماتے تھے۔ چالیس بنتالیس برس کے بعد کتاب اُٹھا کر دیکھی تھی اس لئے اُس کا مطالعہ کرنا اور درس کے لئے اُس پر حاوی ہونا۔ اور طلبا کے اعتراضات کا جواب دینے کے لئے پہلے سے تیار ہونا ان سب چیزوں کا ان کی صحت پر بہت بُرا اثر ہوا۔

جون ۱۹۴۸ء تک اس مدرسہ سے تعلق رہا۔ لیکن میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ مولوی صاحب خوش نہیں رہے کیوں کہ ایک تو نواب صاحب اور وزیر اعظم سے خاص تعلق کی وجہ سے وہ سرکاری آدمی سمجھے جاتے تھے اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے اصول میں بڑے سخت قسم کے انسان تھے انھوں نے جاتے ہی مدرسہ میں نصاب کی اصلاح اور انتظامی امور کی دیکھ بھال اس سختی اور شدت کے ساتھ کی کہ اساتذہ اُس کے متحمل نہیں ہوسکے اور باہمی تعلقات میں بدمزگی کی سی صورت پیدا ہوگئی۔ ۱۹۴۸ء میں ایک مرتبہ مجھ کو بھی رام پور اس غرض سے بلایا تھا کہ میں مدرسہ کے اساتذہ اور طلبار کے سامنے ایک تقریر عربی میں کروں جس میں نصاب کی تبدیلی کی ضرورت پر روشنی ڈالی گئی ہو اور دوسری تقریر مدرسہ ہی میں شب کے وقت ایک عام جلسہ میں سیرت کے موضوع پر کروں حسبِ ارشاد میں رام پور پہنچا لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ جس روز دن کے دس بجے میری تقریر عربی میں ہونے والی تھی اُس سے پہلی شب میں مسٹر چرچل نے فتح اور جنگ کے بند ہو جانے کا اعلان کردیا اور اس خوشی میں سرکاری طور پر تمام دفتروں کے ساتھ ساتھ مدرسہ کی بھی چھٹی ہوگئی اور یہ جلسہ نہیں ہوسکا البتہ شب میں عشار کی نماز کے بعد خواجہ غلام السیدین کی صدارت میں عام جلسہ ہوا۔ سیدین صاحب اس زمانہ میں ریاست کے ڈائرکٹر آف ایجوکیشن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے۔ میری تقریر سے پہلے مولوی صاحب نے ایک تقریر کی جس میں پہلے میرا تعارف کرایا اور اُس کے بعد مدارسِ عربیہ کے مروجہ نصاب کی خامیوں اور کوتاہیوں کا ذکر اس قدر جذباتی انداز میں کیا کہ پندرہ بیس منٹ بولنے کے بعد ہی اُن کی آواز بھرا گئی اور وہ ہانپنے لگے تھے۔ گفتگو اگرچہ عام تھی لیکن مدرسہ کے احاطہ میں اور اُس مدرسہ کے سب اساتذہ اور طلبار کے سامنے ہر شخص یہ سمجھ سکتا تھا کہ گوشۂ خاطر کس طرف ہے اس لئے میرا احساس یہ تھا کہ مدرسہ کے اساتذہ پر اس کا اثر اچھا نہیں ہوا ہوگا۔ چنانچہ میں نے اس تاثر کا اظہار کر بھی دیا تھا۔ لیکن وہ اپنے اصول اور اپنی رائے میں بہت سخت تھے مصلحت کوشی یا کسی ایسی بات پر مصالحت جو اُن کے نزدیک غلط ہو اُن کے لئے بالکل ناممکن تھی۔ غرض کہ معاملات سلجھتے ہی رہے اور مولوی صاحب کو وہاں چین سے رہنا نصیب نہیں ہوا البتہ اس قیام رام پور کے زمانہ میں یہ ایک مفید کام ہوگیا تھا کہ مدرسہ کے لئے ایک جامع اور قدیم وجدید ضروریات پر حاوی ایک نصاب بنا کر پیش کر دیا تھا اور مدرسہ کے انتظام کے سلسلہ میں ایک نئے دستور کی تشکیل بھی کی تھی۔ معلوم نہیں ان دونوں کا کیا انجام ہوا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا جون سنہ ۴۷ء تک رام پور میں قیام رہا۔ اس کے ڈیڑھ ماہ بعد ملک کا بٹوارہ ہوگیا۔ مولوی صاحب کے صاحبزادہ گورنمنٹ آف انڈیا میں ملازم تھے۔ انھوں نے پاکستان کے لئے اپنا نام دیا تھا۔ مولوی صاحب کے آگے پیچھے سوائے اس ایک بیٹے اور اس کی اولاد اور بیوی کے کوئی اور تھا ہی نہیں۔ اس لئے اس بڑھاپے اور ضعیفی میں اگر یہاں رہتے بھی تو کس کے سہارے رہتے۔ اس لئے اپنا ذاتی مکان اور جائداد چھوڑ چھاڑ پاکستان چلے گئے۔ پہلے کچھ دِنوں راولپنڈی میں قیام رہا۔ اس کے بعد، دسمبر سنہ ۴۷ء کو کراچی پہنچے۔ اور آخر اگست سنہ ۵۴ء میں یہیں راہئ ملکِ عدم ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

حلیہ | مولوی صاحب نسلاً راجپوت تھے اس لئے ویسی قدوقامت، ورڈیل ڈول تھا۔ لانبا قد۔ سانولا سلونا رنگ۔ کشادہ پیشانی۔ بڑا سر۔ بھری ہوئی اور گنجان ڈاڑھی ہنسلی چوڑی سینہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کشادہ۔ دوہرا بدن۔ آنکھیں روشن۔ نہ بہت بڑی اور نہ بہت چھوٹی۔ دہانہ فراخ۔ جسم درزشی اور کسرتی معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ کسرت تو کیا کرتے ٹہلنے تک کے عادی نہیں تھے۔ ممکن ہے جوانی میں عادت رہی ہو۔ بڑھاپے میں بھی جوانوں کے سے دم خم رکھتے تھے۔ طبعاً ہنسوڑ تھے قہقہہ لگاکر ہنستے تھے۔ وضع کے نہایت پابند تھے۔ گھر میں قمیص اور پاجامہ پہنے بیٹھے رہتے تھے۔ کالج ہمیشہ اس طرح جاتے کہ سر پر سیاہ رنگ کی اونچی باڑھ کی قلبلاق ٹوپی۔ جسم پر شیروانی اور پاؤں میں کبھی بوٹ اور کبھی گرگابی یا پمپ۔ میں نے جب سے دیکھا ہے ہاتھ میں چھڑی ضرور رکھتے تھے موسم سرما میں فلالین کا چھوٹی مہریوں کا پاجامہ اور چسٹر بھی پہنتے تھے۔ مجموعی حیثیت سے وجیہ اور چہرہ بارعب تھا۔

عام اخلاق و عادات کشمیری گیٹ دہلی میں کالج کی پرانی عمارت کے پاس گلی راجایان کے نام سے ایک چھوٹی سی گلی ہے اس میں ایک مکان لے رکھا تھا جس کو بعد میں خرید بھی لیا تھا اس مکان میں گلی کی جانب ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ بس مولوی صاحب کا کھانے کا کمرہ۔ ملاقات کا کمرہ۔ سونے کا کمرہ۔ مطالعہ کا کمرہ۔ جو کچھ بھی تھا لے دے کے یہی ایک کمرہ تھا۔ باقی سارا مکان زنانخانہ تھا بیوی کا عرصہ ہوا انتقال ہوچکا تھا۔ اس کے بعد کوئی اور شادی نہیں کی۔ زنانخانہ بیٹے اور بہو کے لئے وقف تھا۔ اس چھوٹے سے کمرہ میں ایک کافی چوڑی چارپائی پڑی رہتی تھی اور کونہ میں دو کرسیاں اور صوفہ نما تخت سا بچھا رہتا تھا۔ چارپائی کے داہنی طرف ایک چھوٹی سی میز تھی جس پر بجلی کا لمپ اور کتابیں رہتی تھیں اس کے علاوہ اوپر تلے تین چار تختے اور تھے ان پر بھی کتابیں اور کاغذات بے ترتیبی کے ساتھ رکھے رہتے تھے۔ ایک طرف ایک تپائی پر پاندان رہتا تھا کوئی آگیا یا پان کھانا ہوا تو اُٹھ بیٹھے ورنہ وہیں پلنگ پر لیٹے لیٹے کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ حد یہ ہے کہ سخت گرمی کے دنوں میں بھی رات کو اسی کمرہ میں بجلی کے پنکھے کے نیچے سوتے تھے دیوار سے لگا ایک تختہ کھڑا رہتا تھا جو ان کا مصلی تھا۔ نماز پڑھنی ہوئی اسے بچھا لیا اور پھر کھڑا کردیا کھانے میں زیادہ تنوع نہیں ہوتا تھا۔ لیکن جو کچھ کھاتے تھے اچھا کھاتے تھے خالص گھی کا اہتمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے تھے کھانا پکا ہوا عمدہ قسم کا ہوتا تھا۔ خود بھی اس فن کے ماہر اور نقاد تھے اور کبھی کبھی شوقیہ پکاتے تھے۔ میووں کا بہت شوق تھا۔ ہر موسم کا میوہ خود بھی خوب کھاتے اور بچوں کو بھی کھلاتے تھے اس طرح ایک متوسط درجہ کی صاف ستھری زندگی بڑے چلن اور قرینہ سے بسر کرتے تھے۔ لیکن باہر یہ حال تھا کہ کالج میں جب کبھی کسی بات کے لئے چندہ ہوتا تھا تو فہرست میں پروفیسروں میں زیادہ سے زیادہ رقم جس کے نام کے آگے ہوتی تھی اپنے نام کے آگے بھی وہی رقم لکھتے تھے ریل کا سفر کرتے تو فرسٹ سیکنڈ سے کم میں نہیں کرتے تھے۔ دلی میں کہیں جاتے تو پورا تانگہ کرایہ کر کے جاتے تھے نماز روزہ کے بڑے پابند تھے زکوٰۃ ہر سال پابندی سے نکالتے تھے اور صدقہ خیرات بھی کرتے تھے لیکن اس طرح کہ ایک ہاتھ کی خبر دوسرے کو نہیں ہونے پاتی تھی اور کالج کے اندر بھی اسلامی شعائر کا ادب و احترام ملحوظ رکھتے تھے کالج میں ہر بدھ کو شب میں اسٹاف ڈنر ہوتا ہے جس میں باہر کے تین چار مہمان بھی بہت اونچی حیثیت کے مدعو ہوتے ہیں مولوی صاحب اس قسم کے مواقع پر کھاتے تو تھے کانٹے اور چھری سے ہی لیکن انگریزوں کے برخلاف اس طرح کہ کانٹا داہنے ہاتھ میں رکھتے تھے شروع شروع میں بعض لوگوں کو یہ بات اکھلی ہوگی لیکن بعد میں جب دیکھا کہ امریکن بھی اسی طرح کھاتے ہیں تو پھر کوئی تعجب نہیں ہوتا تھا۔

وضع داری اور شرافت | وضع داری اور شرافت میں یہ عالم تھا کہ اس طرح کے لوگ دنیا میں کم ہی ہوں گے خواجہ عبدالمجید صاحب دہلوی سے بڑا دوستانہ تھا ہفتہ میں منگل کے دن مولوی صاحب خواجہ صاحب کے ہاں جاتے تھے اور جمعہ کو خواجہ صاحب یہاں آتے تھے۔ گرمی ہو۔ برسات ہو۔ جاڑا ہو کوئی موسم اور کوئی حال ہو بغیر کسی ناگزیر مانع کے ناممکن تھا کہ مولوی صاحب دلی میں ہوں اور اُن کے اس معمول میں فرق آجائے فرماتے تھے کہ میں دوستی بہت کم کرتا ہوں۔ کیوں کہ جانتا ہوں کہ اس کے فرائض وواجبات کا نباہنا آسان نہیں ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی عید بقر عید پر تو لازمی طور پر مولوی صاحب کے ہاں جاتے ہی تھے یوں تیسرے چوتھے مہینہ بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ مولوی صاحب کے لئے ضروری تھا کہ اُس کے جواب میں وہ خود بھی آئیں چنانچہ وہ بھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی رفتار سے دفتر ندوۃ المصنفین میں تشریف لاتے تھے۔ شرافت کا یہ عالم تھا کہ پیٹھ پیچھے بھی کسی کا تذکرہ کرتے تو اُس کی حیثیت کے مطابق القاب و آداب کے ساتھ اُس کا نام لیتے تھے مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انھوں نے کبھی مجھ سے مولانا عتیق الرحمٰن صاحب کی خیریت پوچھی ہو اور بغیر لفظ "جناب" کے صرف "مفتی صاحب" کہا ہو علماء کا بڑا ادب و احترام کرتے تھے اور اُن سے بہت نیازمندی سے ملتے تھے۔ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے خاص تعلق تھا۔ آمد و رفت کی راہ و رسم نہیں تھی لیکن جب کبھی ملتے تھے جھک کر فروتنی سے ملتے تھے اُمرا اور رؤسا سے ملنے میں تکلف ہوتا تھا۔ ارباب علم سے مل کر انھیں حقیقی راحت اور خوشی ہوتی تھی۔

طبیعت بے حد غیور اور خود دار واقع ہوئی تھی۔ مجال نہیں تھی کہ کبھی کسی نازک سے نازک موقع پر بھی اپنی حاجت یا ضرورت کسی پر ظاہر کریں اور اُس سے مدد کے خواستگار ہوں کراچی پہنچنے کے بعد ان کو مکان کے سلسلہ میں کافی تکلیفیں ہوئیں اگرچہ وہاں اُس زمانہ میں وزیر مہاجرین ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے جو خود مولوی صاحب کے بڑے سعادت مند شاگرد تھے اور ان کے علاوہ سینکڑوں شاگرد اور دوست اور تھے جو مختلف محکموں میں بڑے بڑے عہدوں پر تھے لیکن مولوی صاحب ان سے مدد تو کیا مانگتے انھوں نے سرے سے ان لوگوں سے ملنا جلنا ہی بند کر دیا تھا کیوں کہ اُن سے ملنے کے معنی بھی امداد طلبی کے مرادف تھا۔ کوئی معاملہ یا مشورہ ہوتا تو اُس پر کافی غور و خوض کرتے اور آخر جب ایک رائے قائم کر لیتے تو پھر اُس سے ہٹنا اُن کے لئے ممکن نہ تھا کالج کی اسٹاف میٹنگ۔ یونیورسٹی کی اکاڈمک کونسل یا کسی اور میٹنگ میں جو بات اپنے نزدیک حق ہوتی تھی اُسے برملا اور پوری قوت کے ساتھ کہتے تھے اور اس بارہ میں بڑی سے بڑی شخصیت کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اُن کی صاف گوئی بسا اوقات اُن کے لئے مشکلات کا باعث بن جاتی تھی لیکن وہ مردانہ وار اُس کا مقابلہ کرتے تھے اور اپنے طریق عمل پر پشیمان نہیں ہوتے تھے۔

اپنے مرتبہ اور علم کا وقار ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ عمر بھر کبھی ٹیوشن نہیں کیا ایک مرتبہ پرنسپل صاحب کی درخواست پر ایک سول آفیسر انگریز کو ہفتہ میں تین دن عربی پڑھانی منظور کرلی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھی۔ جب مہینہ پورا ہوا تو انگریز نے کہا میں کیا دے دوں۔ مولوی صاحب نے کچھ لینے سے انکار کیا۔ لیکن جب ادھر سے اصرار زیادہ ہوا تو انھوں نے کہا اچھا ایسا ہی ہے تو سو روپیہ دے دیجیے۔ یہ سُن کر انگریز بہت خوش ہوا اور بولا کہ آج آپ پہلے شخص ملے ہیں جو اپنے علم کے قدردان ہیں ورنہ آپ سے پہلے کسی مولوی نے ۲۰ - ۲۵ روپیہ ماہوار سے زیادہ نہیں مانگا۔

ان کے پاس متعدد یونیورسٹیوں کے مختلف امتحانات کے پرچے ہمیشہ رہتے تھے اور اس سلسلہ میں سفارشوں کی بھرمار بھی رہتی تھی لیکن وہ سفارش پر کسی کو پاس کرنا بدترین اخلاقی معصیت سمجھتے تھے اور اس سے ہمیشہ مجتنب رہتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صاحب تشریف لائے بڑی عقیدت اور ارادت سے ملے اور عطر کی چند شیشیاں بطور تحفہ پیش کیں۔ مولوی صاحب نے ہر چند معذرت کی لیکن نہ مانے۔ آخر لے کر رکھ لیں۔ پانچ چھ دن کا غوطہ دے کر یہ صاحب پھر دوبارہ حاضر ہوئے اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ایک امیدوار کی سفارش کی۔ یہ سنتے ہی مولوی صاحب فوراً اُٹھے عطر کی شیشیاں لا کر ان کو واپس کیں اور فرمایا "لیجیے! یہ ہے آپ کا تحفہ! کیا اس کے بدلہ میں آپ میری امانت اور دیانت خریدنی چاہتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا "بس فوراً تشریف لے جائیے میں آپ سے مزید گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا۔

میرا تعلق

سنہ ۳۱ء میں مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی کے تعلق سے جب میں دلی آیا تو چونکہ مولوی صاحب سے ادبی اور علمی ارادت و عقیدت پہلے سے تھی اس لیے اُن کی خدمت میں آنا جانا شروع کر دیا۔ سنہ ۳۲ء میں جب میں نے بی۔ اے پاس کر لیا تو میمن عبدالعزیز صاحب سے استفادہ کی غرض سے ارادہ کیا کہ علی گڑھ جا کر ایم۔ اے عربی میں داخلہ لے لوں لیکن مولوی صاحب سے اس کا ذکر آیا تو بڑی شفقت فرمایا کہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب سے پڑھ لینے کے بعد اب تم کو عربی میں اور کس سے پڑھنا ہے۔ اب تم مطالعہ کرو اور اُس میں لگے رہو تم خود میمن بن جاؤ گے۔ اس کے بعد فرمایا کہ میں دو سال کے بعد کالج سے سبکدوش ہو رہا ہوں اگر تم دہلی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کر لو تو میں تم کو اپنی جگہ رکھ دوں گا اور مجھ کو بھی خوشی ہوگی کہ میرا جانشین کوئی نااہل نہیں ہوگا۔ مولوی صاحب نے یہ بات کچھ ایسی محبت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور سوز سے کہی تھی کہ دل میں اُتر گئی اور میں نے ہاں کر لی۔ اس کے بعد وہ مجھ کو سینٹ اسٹیفنس کالج کے پرنسپل اس۔کے سین صاحب کے پاس لے کر پہنچے اور اُن سے اُسی وقت صاف کہہ دیا کہ یہ کے کالج کے ایم۔اے میں صرف ڈگری لینے کی غرض سے داخلہ چاہتے ہیں ورنہ ان کو پڑھنا وڑھنا کچھ نہیں ایم۔اے کلاس کو اب بھی پڑھا سکتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ میں نے ہی خود اس کو اس پر آمادہ کیا ہے۔ تاکہ کل میرے بعد یہ میرا جانشین ہو سکے۔ پرنسپل سین صاحب ہنسے بھی اور خوش بھی ہوئے اور اب میں باقاعدہ مولوی صاحب کا شاگرد ہو گیا۔ مولوی صاحب نے جو بات شروع میں کہی تھی وہ برابر ان کے دل کو لگی رہی اور انھیں اس وقت تک چین نہیں آیا جب تک کہ انھوں نے میرا تقرر اپنی جگہ پر کروا نہیں لیا۔ میرا تعلق اگرچہ استادی شاگردی کا تھا لیکن میں کیا کہوں کہ وہ کس درجہ مجھ پر شفیق تھے اور کس طرح میری ایک ایک بات کا خیال رکھتے تھے ۴۷ء کے ہنگامہ میں، ستمبر کو جب میرا سب کچھ لٹ گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ انھیں دنوں میں مجھ کو کپکپی کے ساتھ بخار آگیا تو میں اور مولانا عتیق الرحمٰن صاحب دونوں میں سے کسی کے پاس ایک چادر تک نہیں تھی کہ میں اُس لرزہ کی حالت میں اوڑھ لیتا۔ بالآخر مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ایک دوست سے چادر مانگ کر لائے اور مجھ کو اڑھائی۔ مولوی صاحب کا محلہ اس لوٹ مار سے محفوظ رہا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد مولوی صاحب مجھ سے ملے تو مجھ کو دیکھ کر اُن کا جی بھر آیا۔ سینہ سے لگا لیا اور اسی وقت تانگہ میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے وہاں پہنچ کر زنان خانہ میں پردہ کرایا اور ایک بڑے سے کمرہ میں جہاں اُن کا سب سامان اسباب رکھا تھا۔ لے جاکر کھڑا کر دیا اور آبدیدہ ہو کر فرمایا۔ اب یہ سب سامان اور گھر تمہارا ہے۔ تم ہرگز خیال مت کرنا کہ تمہارا گھر لٹ گیا ہے۔ میں نے بچشم نم اُن کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سب انتظام ہو جائے گا وہ نہ مانے اور چلتے چلتے پھر بھی چند چیزیں میرے ساتھ کر دیں۔ انھیں چیزوں میں شیروانی کا ایک عمدہ باوضع کپڑا بھی تھا جو انھوں نے اپنے لئے خرید رکھا تھا۔ کیا عجیب اتفاق ہے کہ اس واقعہ کے ٹھیک چھ سال کے بعد جب مجھ کو حضرت مرحوم کی وفات کی اطلاع کا خط ملا ہے تو میں اُس وقت انھیں کے عطا فرمودہ کپڑے کی شیروانی پہنے دفتر میں بیٹھا تھا اور ایک صاحب اس کپڑے کی تعریف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر رہے تھے تو میں اُن کو وہی واقعہ سنا رہا تھا کراچی میں اُن کو میرے کلکتہ آنے کی خبر ملی تو مبارک باد کا خط لکھا اور ساتھ ہی تحریر فرمایا کہ تم سرڈینی سن راس کی کرسی پر بیٹھے ہو۔ لیکن ڈینی سن راس دوسروں سے کام لینا خوب جانتا تھا اور خود کام کم کرتا تھا۔ تم سے امید ہے کہ خود بھی کام خوب کروگے اور دوسروں سے بھی کام خوب لوگے۔ آخر میں بالکل معذور ہو گئے تھے لیکن اس پر بھی صرف خیریت طلبی کے لئے ایک سطری خط برابر لکھتے رہتے تھے۔ محض اُن سے ملنے کی غرض سے بارہا کراچی کا ارادہ کیا لیکن مجھ کو تو کراچی جانا آج تک نصیب نہیں ہوا اور وہ ملکِ عدم کو چل بھی دیئے

شاہراہِ عدم چہ ہموار ست   چشم بر بستہ میتواں رفتن

رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃ

تفسیر مظہری

عربی کی ایک لاجواب تفسیر

تفسیر مظہری اپنی غیر معمولی خصوصیات کے لحاظ سے بہترین تفسیر سمجھی گئی ہے۔ اِس عظیم الشان تفسیر کے مطالعہ کے بعد تفسیر کی کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہتی اس میں وہ سب کچھ ہے جو دوسری تفسیروں میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے مدلول کلامِ الٰہی کی تسہیل و تفہیم، تاریخی واقعات کی تحقیق و تدقیق۔ احادیث کے استقصاء۔ احکامِ فقہی کی تفصیل و تشریح اور لطائف و نکات کی گل پاشی میں "تفسیر مظہری" کے درجہ کی کوئی کتاب عربی زبان میں موجود نہیں امام وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کے کمالاتِ علمی کا یہ عجیب و غریب نمونہ ہے۔ الحمد للہ کہ اب اس بے مثال تفسیر کی تمام جلدیں طبع ہو گئی ہیں۔ قیمت تا بحدِّ امکان کم سے کم رکھی گئی ہے پوری کتاب کی دس ضخیم جلدیں ہیں۔

ہدیہ غیر مجلد:۔ جلد اول سات روپے۔ جلد ثانی سات روپے۔ جلد ثالث آٹھ روپے۔ جلد رابع پانچ روپے۔ جلد خامس سات روپے۔ جلد سادس آٹھ روپے۔ جلد سابع سات روپے۔ جلد ثامن سات روپے جلد تاسع پانچ روپے۔ جلد عاشر پانچ روپے۔ سیٹ کامل چھیاسٹھ روپے۔ رعایتی ساٹھ روپے

© rasailojaraid.com